بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# اشارات

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میرے ضمیر کی گہرائیوں سے ایک دھیمی سی آوازہ اٹھتی ہے اور پھر وہ صور اسرافیل کی طرح حشر انگیز بن جاتی ہے۔ اس آوازہ کا مخاطب بالعموم میں خود ہی ہوتا ہوں۔ مگر بعد میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو میری ساری مقصدی برادری کے لیے متاعِ مشترک ہے تو میں اسے سب تک پہنچانے کے لیے لفظوں کا جامہ پہنا دیتا ہوں۔ میری بات اگر غلط ہو تو میں خدا سے بھی معافی مانگتا ہوں، آپ بھی میرے لیے معافی مانگیے، درست ہو تو میں بھی اس پر غور کروں، آپ بھی کیجیے اور ہم سب دعا کریں کہ خدا اس آوازۂ ضمیر کو باعثِ خیر و برکت بنائے۔

ملک کا سیاسی ماحول سخت تاریک ہے، دینی لحاظ سے دیکھیں تو چاروں طرف سے ضلالت و رذالت کے طوفان اٹھ رہے ہیں ـــــ اور اپنے آپ کو دیکھیں تو جہاں یہ وجہ شکر سامنے آتی ہے کہ ہمارے دلوں میں ایمان کی شمع ہنوز جھلملاتی ہے۔ وہاں ہم یہ محسوس کر کے اندوہگیں ہو جاتے ہیں کہ ماحول کی تاریکیوں اور ضلالتوں نے ہم پر قابو نہیں پایا مگر اثرات ضرور ڈالے ہیں۔ یہ احساس تقاضا کرتا ہے کہ اپنے ایمان کو زندہ تر اور اپنے شعور کو بیدار تر کیا جائے۔

بڑے کام کرنے والوں کو ہر وقت تجدیدِ ایمان، تجدیدِ نظریہ اور تجدیدِ شعور کرتے رہنا چاہیے۔ اسی کا نام تذکرہ ہے، جو مطلوبِ دین ہے۔ اپنے اصول و مقاصد کو بار بار سامنے لانا، اپنی روایات و افکار کے چراغوں کی لو کم نہ ہونے دینا۔ مخصوص لہجے اور اصولی کاموں کے لیے یہ ایسی شدید بنیادی ضرورت

ہے کہ یہ اگر بالکل ہی ملحوظ نہ ہو تو سارا کھیل بکھر جائے گا۔ اور اگر اس کا احساس اور اس پر عمل ضرورت سے کم ہو تو چھوٹے چھوٹے انحرافات اور تصرفات خلل پیدا کریں گے اور خود اپنے اندر حالتِ اطمینان باقی نہیں رہے گی۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بجلی کی رو یا بیٹری کی پاور کو ٹسٹ کرنے کے لیے یا گاڑی کے پہیوں میں بھری جانے والی ہوا کا دباؤ معلوم کرنے کے لیے، یا کم سے کم درجہ میں ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھنے کے لیے ایک سوئی یہ دکھاتی ہے کہ صورت درست ہے یا نہیں۔ بعض اوقات اس سوئی کو آپ تیزی سے اِدھر اُدھر ہوتے، بلکہ لرزتے دیکھتے ہیں۔ دراصل یہ سوئی اگر اپنے مقررہ نشانِ توسط پر رُک جائے تو ٹھیک، ورنہ وہ سراپا اضطراب بن جائے گی۔

ایسی ہی ایک سوئی ہمارے ضمیر کے اندر ایک مخفی ڈائل پر لگی ہوئی ہے۔ آپ جہاں اپنے اُصول و مقاصد اور روایات و اقدار سے ہٹے، یہ سوئی اِدھر اُدھر ہونے لگتی ہے۔ دوسرے معنوں میں آپ حالتِ اطمینان کھو بیٹھتے ہیں۔ آپ کو اپنے اُوپر، اپنے جادہ و منزل پر، اپنے زادِ راہ پر یہ اطمینان نہیں رہتا کہ آیا یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ اس قسم کی حالتِ بے اطمینانی کا صحیح طریقے سے اگر نہ آدمی خود ازالہ کر سکتا ہو، نہ دوسرے رفیقوں یا اکابر سے مدد لے سکتا ہو یا ایسے احساس مضطرب کو کسی حل کر سکنے والے کے سامنے رکھنے میں جھجک ہوتی ہو، یا وہ بات کسی اہم جگہ کہہ دے تو آگے سے ڈانٹ پڑ جائے، یا ماحول اس کے ساتھ ہمدردی کرنے پر تیار نہ ہو تو وقت گزرنے کے ساتھ بے اطمینانی کی ظاہری کیفیت تو گزر جائے گی، مگر دل میں ایک زخم چھوڑ جائے گی ___ اس سے قوتِ عمل کم ہو جاتی ہے۔ پھر اگر ایسے ہی زخم اور لگتے رہیں اور چارہ ساز و دمساز کوئی نہ ہو تو "من ہمہ داغ داغ شد" ہو جاتا ہے اور آدمی کی روش میں اس کے ارادے کے بغیر یاس و جمود کا ایک رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

---

ذرا یاد کریں ۱۹۴۱ء سے کئی سال بعد تک کا دورِ رفتہ! ہم بڑا سرمایۂ اطمینان لے کر چلے تھے۔ اپنے نظریات، اپنے طریقِ کار، اپنی قیادت، اپنی قوتوں، اپنے زورِ استدلال، اپنے دعوتی پھیلاؤ، اپنی پابندیٔ اُصول، اپنے صاف ستھرے کردار اور اپنی مرکزی قیادت کے علاوہ اپنے مقامی امراء اور

ناظمین پر کس درجہ اطمینان تھا ۔

مولینا مودودیؒ نے دین و سیاست کو ایسا ہم آہنگ رکھا اور ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہونے کی حیثیت سے اس شان سے چلایا کہ جب کبھی اسلامی ریاست کے طے شُدہ اُصول و نہج اور پیمانۂ پسندو ناپسند اور اخلاقی حدود سے تجاوز یا پسپائی کی کوئی خفیف سی حرکت بھی کہیں واقع ہوئی تو مختلف اطراف سے مولانا کے سامنے شکایات آنے لگیں ۔ مولانا صبر و تحمل سے ہر بات کو سُنتے بلکہ کرید کرید کر دریافت کرتے ۔ مجلسِ شوریٰ میں رپورٹیں طلب کرتے ۔ انہوں نے کبھی کسی غلط حرکت کو زورِ کلام سے ملبوسِ جواز پہنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ساری معلومات جمع ہونے پر جماعت کی پہلے سے قائم شدہ اُصولی پالیسی کے خطوط زیادہ واضح اور نمایاں کر دیئے ۔ اور غلط اقدامات کو مسترد کر دیا ۔ پالیسی جب اپنی جگہ پر سیٹ ہوگئی ۔ یا دوسرے لفظوں میں آپ کے قدم اُصول کی شاہ راہ پر واپس آگئے یا روایت کی ٹوٹی ہوئی لکیر بحال ہوگئی تو احساس کی سُوئی پھر اطمینان کے نقطۂ اعتدال پر آکر رُک گئی ۔

لیکن اگر خدانخواستہ ایسا ہو کہ چھوٹی چھوٹی بے اطمینانیاں اور بڑی بڑی اطمینانیاں وقتاً فوقتاً پیش آنے لگیں اور اُن کا تدارک نہ ہوسکے ، کوئی ایسا مرکزِ محبت نہ ہو جو آپ کے سر اور شانوں پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہوئے آپ کو صحیح صورت سمجھائے یا آپ کا اُٹھایا ہوا نکتہ صحیح ہونے کی صورت میں شکریہ کے ساتھ اسے قبول کرے تو پھر اندر کے ان چھوٹے چھوٹے زخموں پر کھرنڈ سا جمتا رہتا ہے' مگر بہ درد کرتے ہی رہتے ہیں ۔ بے اطمینانی کی زد میں آنے والا آدمی بار بار توجیہیں کرکے کسی بات کو ، کسی عمل کو ، کسی اقدام کو ، کسی اتحاد کو ، کسی نعرے کو ، کسی کارروائی کو ، کسی شخصیت کے رُخِ کردار کو آنکھیں بند کرکے بھی صحیح قرار دیتا ہے ، توجیہیں بھی پیدا کرتا ہے ، لیپا پوتی کے طریقے بھی اختیار کرتا ہے ، اپنے آپ کو فریب بھی دیتا ہے ـــــ اور بظاہر وہ پیش آمدہ آزمائش سے بچ نکلتا ہے جو ایک بار تو اُس کے دل و دماغ کو ہلا ڈالتی ہے ۔ لیکن خود فریبی مسائل کا حل نہیں ہے ۔

آخر ذرا آپ اپنے اندر کا جائزہ لیجیے ۔ عشا کے سونے سے پہلے جا نماز پر بیٹھ کر کچھ خدا سے رابطہ کیجیے اور پھر اس سوال پر غور کیجیے کہ آپ کو تحریکی معاملات میں ہر پہلو سے پورا پورا اطمینان ہے ؟ اگر نہیں ہے تو کس عقیدے ، جذبے یا شعور کی تجدید کی ضرورت ہے ؟

---

بڑے بڑے اجتماعی نصب العین (خصوصاً اسلامی) لے کر چلنے والوں کی زندگیاں اور ان کا پیدا کردہ ذہنی یا سماجی ماحول دوسروں سے زیادہ روشن ہونے چاہییں۔ عمومی فضا محبت و ایثار کی ہونی چاہیے۔ ہر کوئی دوسروں کی قدر کرنے والا اور ان کی ہر تکلیف کا محسوس کرنے والا ہو اور وہ اہتمام کرے کہ اگر وہ کوئی خدمت نہ کر سکے گا تو کسی دوسرے کو کسی طرح کی اذیت بھی اپنی جانب سے نہ پہنچنے دے گا۔

پھر برادرانہ جذبے سے دل اتنے کھلے ہونے چاہییں کہ اگر کسی شخص کے طرزِ عمل پر کوئی دوسرا اعتراض اُٹھائے یا کسی مجلس میں تنقید کرے تو وہ دل میں انتقامی جذبے کی گرہ ڈال کر نہ بیٹھ جائے کہ آئندہ جب کبھی موقع ملے گا، وہ بھی نہلے کا جواب دہلے سے دے گا۔

اِس سے بھی زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ ہمارے کارکن جن میں بہت سے اچھی طرح ماہر تکلم نہیں ہوتے، زورِ استدلال سے کام نہیں لے سکتے، ان میں سے کئی دیہاتی ہوتے ہیں جو ضرورت سے کہیں زیادہ اپنے سے بڑوں کا احترام کرتے ہوئے اُن کے سامنے کسی اختلافی نکتے پر زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرتے، ہمارا فرض ہے کہ ان سب کو گلے لگائیں اور ان کے غیر ادبی اور سادہ اور کھردرے اندازِ بیان پر انھیں ڈانٹنے کے بجائے اُن کے نفسِ مدعا کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ان سے خود سوال کر کر کے پوری بات معلوم کریں۔ وہ بیچارے تو اپنے اُس درد کو بیان کرنے کے لیے الفاظ اور انداز نہیں پاتے جو اس کانٹے کی وجہ سے ہے جو اُن کے ضمیر میں خلش کر رہا ہے۔ آپ پہلے انھیں دردمند اور دُکھی تو سمجھیے، پھر اُن کی بات سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ سوالات، اعتراضات اور تنقید چونکہ اسلامی نظامِ جماعت کی صحت مندی کا لازمہ ہیں، اس لیے ان کے راستے کھلے رہنے چاہییں۔ جب کبھی ان راستوں کو بند کیا جائے گا یا ان کے دروازوں میں بھاری کواڑ لگا کر ان کو مقفل کر دیا جائے گا تو تنظیم کی صحت برقرار نہ رہ سکے گی۔ سوالوں اور اعتراضات کا آرام سے جواب دیجیے۔ اچھے دلائل سے جواب دیجیے۔ مخاطب کا محض منہ بند کرنے والا جواب نہ دیجیے۔ جواب اطمینان دلانے والا ہو۔ اُس کے اطمینان میں جو خلل آیا ہے، اُسے دُور کیجیے۔

تحریکی شعور کی اس لحاظ سے بھی بار بار تجدید کرنی چاہیے کہ اسلامی تحریک کے اُصولوں کا اطلاق بڑوں اور چھوٹوں پر یکساں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی عام کارکن غلطی کرے یا رکن لغزش کھائے تو جس درجہ کی گرفت اس کے لیے ہے، اُسی درجے کی گرفت ویسی غلطی پر عہدہ داروں اور قائدین کی بھی ہوتی چاہیے۔ چھوٹوں پر گرفت کرنا اور بڑوں سے چشم پوشی کرنا ایسا خطرناک طریقہ ہے جس کے لیے رسول اللہؐ نے سخت وعید سنائی ہے۔

مثلاً جماعت کی کسی معاملے میں مقررہ پالیسی کے ہوتے ہوئے اگر ایک معمولی رکن کو حق نہیں کہ اس سے انحراف کرے یا مقررہ پالیسی میں سے ایک اور شاخ نکال لے تو اس کے کسی عہدہ دار اور لیڈر کو بھی اس کا حق نہیں۔ جماعت کے کارفرما اداروں اور اشخاص نے کسی شخص یا گروہ کو اسلام، جمہوریت اور امن کا دشمن قرار دیا ہو تو کسی چھوٹے یا بڑے کو یہ جسارت نہیں کرنی چاہیے کہ وہ اپنے گروہ کو اسلام، جمہوریت اور اس کا خادم قرار دے۔ یہ ڈھیل اگر جماعت کے تمام افراد کو دے دی جائے کہ وہ جو اختلافی راہیں چاہیں اختیار کریں۔ اور انھیں جس دائرے میں چاہیں بیان کریں تو ہماری پالیسی مینارِ بابل کا تماشا پیش کرے گی۔ ایسی گنجایش رکھنے سے ایک اُصولی و مسلکی جماعت کا تو پورا ڈھانچہ ٹوٹ جائے گا۔

اسی طرح ہماری محکم روایات کا معاملہ ہے، جو شروع سے قائم ہیں۔ اور جن کے بارے میں قراردادیں اور فیصلے اور بیانات موجود ہیں۔ کن طریقوں کو اختیار کرنا ہے، کن کو نہیں، کن عناصر سے اتحاد ہو سکتا ہے، کن سے نہیں۔ کیا نعرے لگائے جا سکتے ہیں کیا نہیں، مظاہروں میں کیا حرکتیں کی جا سکتی ہیں اور کیا نہیں، روایات کا ایک معلوم و معروف خاکہ موجود ہے جسے ہمارے مخالف بھی جانتے ہیں۔ اسے توڑیں تو ہمارے اُصول ٹوٹ جاتے ہیں۔ یعنی یہ خاکہ اُصولوں ہی کے عملی انطباق سے نمودار ہوا ہے اور اسے بار بار توڑنا اور بدلنا ہمارے جماعتی و تحریکی تشخص کے لیے ضرر رساں ہے۔

دنیا کی سب سے بڑی بلا تضاد ہے۔ یہ فرد کے خیالات اور طرزِ عمل میں ہو، حکومت میں ہو، تعلیم میں ہو، نظامِ جسمانی میں ہو، ہر جگہ وہ باعثِ فساد ہے۔ خصوصاً تنظیمی ہیئتوں کے لیے تو وہ مہلک ہے۔ ہلکے ہلکے اور دھیمے دھیمے تضاد اس طرح عمل کرتے ہیں جیسے سلو پوائزن۔ اوّلاً خرابیاں آہستہ آہستہ سطح سے نیچے ہی پھیلتی جاتی ہیں۔ پھر جب اپنے نتائج کے ساتھ وہ ظاہر ہوتی ہیں تو اُن پر قابو

نہیں پایا جا سکتا۔ عقیدہ اور عمل میں، دعوت اور کردار میں، ذکر و عبادت اور سیاست و معیشت میں، جہاں بھی کہیں تضاد کا روگ ہوگا وہ اپنے کرشمے دکھائے گا۔ اور درحقیقت یہ تضادات ہی ہوتے ہیں کہ ماضی اور حال میں، اعلانات اور کارروائیوں میں، بڑوں اور چھوٹوں کے رویوں میں، ظاہر اور باطن میں، جماعتی پالیسیوں کی تعبیرات میں پہلے دھیمے دھیمے طریق سے کام کرتے ہیں، اور پھر زور شور سے۔ اگر پہلے مرحلے میں ان کی روک تھام نہ ہو سکے تو پھر اس تباہ کن طوفان کو کنارے پہ کھڑے ہو کر دیکھنے والے رنج و غم سے دیکھتے ہیں، مگر خون کے آنسوؤں سے بھی اس کو روک نہیں سکتے۔

میرے پیارے ساتھیو! عزیز بھائیو! محترم بزرگو! خدا کے لیے نگاہ رکھو کہ کسی پہلو سے تضادات نہ ابھرنے پائیں۔ تضادات کا شجرۃ الزقوم ایک دفعہ جڑ پکڑ گیا تو آپ کوئی کام نہ کر سکیں گے۔

---

اُوپر جن باتوں کا ذکر ہوا ہے ان کے بارے میں یہ بھی جان لیجیے کہ خرابیوں کا حل حقیقی اور مؤثر لیپا پوتیوں سے نہیں ہوا کرتا۔ زخم کا یہ کوئی علاج نہیں ہے کہ آپ نے اس پہ نہایت رنگین ریشمی پٹیاں لپیٹ دیں اور بیان دے دیا کہ یہاں کوئی زخم نہیں ہے۔ گندگی کا ازالہ یوں نہیں ہو سکتا کہ جہاں جہاں وہ سامنے آئے یا کوئی دوسرا آدمی متوجہ کرے۔ آپ وہاں وہاں اخبار کا کاغذ اس پر پھیلا کر کونوں پہ پتھر رکھ دیں۔ معاملات کو ہمیشہ صاف طور سے لینا چاہیے۔ آپ کے اسلامی طریقے سے جب کوئی انحراف ہو تو صاف صاف کہیے کہ یہ انحراف ہوا ہے اور کوئی دوسرا توجہ دلائے تو اس کی بات کو مانیے کہ تم نے ٹھیک توجہ دلائی۔ جس کسی نے قدمِ انحراف اُٹھایا ہو اُسے بالمشافہ کہیے کہ صاحب! آپ نے یہ غلطی کی ہے اور ایسی غلطی کی گنجائش ہمارے اصولوں اور روایات میں نہیں ہے۔ پھر اِن صاحب کے تعاون سے کسی قطعی اور حتمی فیصلہ تک پہنچیے اور اس کو ڈکلیئر کیجیے۔ بے شمار ایسے اختلافی یا نزاعی معاملات پیدا ہو کر پھیلتے رہیں گے، اگر ہم نے ایمانی و اخلاقی جرأت کے ساتھ روک تھام نہ کی۔

ہم دینِ حق کے علمبردار اور شہادتِ حق کے ذمہ دار ہیں۔ ہمیں حق کہنا چاہیے، دوسروں کے متعلق بھی، اپنے متعلق بھی۔ کبھی آدھا حق کہہ کر دوسرا آدھا حق چھپا نہ دینا چاہیے۔ اور واقعہ کے کسی

حصے کو لپیٹنا نہیں چاہیے - بلکہ جرأت سے پورا حق کہنا چاہیے، خواہ اس کی زد ہم پر ہی پڑتی ہو -

---

تاریخ میں ایک بڑا تضاد دین و سیاست کا لوگوں نے پیدا کر دیا تھا اور صدیوں کے عمل سے ذہن اس کے اتنے عادی ہو گئے کہ اب اسلامی سیاست کی راہ پر راست روی خود ہمارے لیے سخت مشکل مسئلہ بن رہی ہے۔ تجربات بڑے تلخ ہیں۔ کبھی دینداری اور اخلاق کی طرف جھکاؤ ہوتا ہے تو سیاست کی راہیں اتنی تنگ کر دی جاتی ہیں کہ آدمی کے داخلے اور پیش قدمی کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ پھر جب ردِ عمل سیاسی ذمہ داری کی طرف مائل کرتا ہے تو دینی و اخلاقی رنگ اس طرح اُڑ جاتا ہے کہ ہماری سیاست گری میں لادینیت پسند جماعتوں کی سیاست بازی کے بالمقابل کوئی امتیازی پہلو باقی نہیں رہتا۔

میرا خیال یہ ہے کہ اسلامی سیاست کا کامیاب ترین دَور وہی تھا جس کی زمام کار مولانا مودودیؒ کے ہاتھ میں تھی۔ پھر مارشل لا کے آنے سے سب کچھ تلپٹ ہوا۔ اور نظم کے علاوہ ذہنی وحدت اور اطمینان کی چولیں ایسی ڈھیلی ہوئیں تو کسی طرح چول سے چول مل ہی نہیں پا رہی ہے۔

کسی تفصیل میں جائے بغیر تمام شرکائے تحریک سے عرض ہے کہ سیاست کو دینی سیاست کی صورت دیجیے، اس میں دین اُبھرا ہوا معلوم ہو، آپ دینی مقصد کی طرف بڑھیں۔ اور کسی دینی نکتے ہی پر اتحاد کریں اور اتحاد ان سے ہی کریں جن سے متعلق جماعت عام طور پر جانتی ہو کہ وہ مخالفِ دین یا فسطائیت پسند یا فاسد نظریات و کردار رکھنے والے لوگ نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم جائے نماز سے کر اسمبلی تک تمام معاملات اُصولِ دین اور اخلاقی قدروں اور جماعتی روایات کی پابندی کریں۔ اور اپنے آپ کو لادین یا بے دین عناصر سے ممتاز رکھنے کا اہتمام کریں۔

ہر قسم کے سیاسی جوڑ توڑ اور مہرہ بازیوں کا نام اسلامی سیاست نہیں ہے۔

---

ہمارے کام کی ساری اساس خدا پرستی پر ہے۔ کوئی بھی دائرہ، کوئی بھی سرگرمی اور کوئی بھی مرحلہ ہو، اگر خدا سے محبت اور خدا کا خوف کارفرما نہ ہو تو پھر کام نمائشی اور ریائی ہو جاتے ہیں اور نشۂ خود پسندی طاری ہو جاتا ہے۔

کسی معاملے پر غور کرتے ہوئے، مشورہ و بحث کرتے ہوئے، اعتراضات سنتے اور ان کے جواب دیتے ہوئے، پھر کسی فیصل شدہ صورت پر عمل کرتے ہوئے قدم بہ قدم اور نفس بہ نفس خدا کی محبت کی مشعل بلند رکھنی چاہیے، خدا کے خوف سے لرزنا چاہیے۔ اور خدا کے ذکر سے قوت حاصل کرنی چاہیے۔

ہم لوگ اگر مسجد کی عبادات کے دائرے سے باہر سیاست کے دائرے میں زبان سے دعوے کرتے ہوئے، جوشِ تقریر دکھاتے ہوئے، نعرے بلند کرتے ہوئے، مظاہرے کرتے ہوئے، کسی کی حمایت اور کسی کی مخالفت کرتے ہوئے، کسی سے قرب بڑھاتے اور کسی سے دُوری پیدا کرتے ہوئے قرآن و حدیث کے تحت جماعت کی رہنمائی کے مقررہ خطوط سے انحراف کر کے لغزش کھاتے ہیں اور اس لغزش کی وجہ سے عوام میں شکایات و اعتراضات یا دبے دبے اضطرابات پیدا کر دیتے ہیں تو یہ محض سیاسی غلطیاں ہی نہ ہوں گی، ایک خدا پرست گروہ کے معیارات کے لحاظ سے گناہ کی تعریف میں بھی داخل ہوں گی۔ امیر جماعت، نظم جماعت یا جماعت کی پالیسیوں سے انحراف، یا بے جا قسم کا اختلاف، یا غلط مقام پر اظہارِ اختلاف اور غلط لہجے میں اظہارِ اختلاف، اور پھر بزبانِ عمل اعلانِ اختلاف اپنوں کے علاوہ مخالفین پر بھی اثرانداز ہوتا ہے۔ اور ان عوام کے ذہنوں میں بھی غبار بھرتا ہے جو ہماری دعوت کے مخاطب ہیں۔ بنابریں ایسی چیزیں خدا کی محبت اور خدا کے خوف کے حلقوں سے سر باہر نکالے بغیر عمل میں آ نہیں سکتیں۔ اور کسی دینی جماعت کے لیے یہ بڑا حادثہ ہے کہ خدا کی محبت اور خدا کے خوف سے آزاد ہو کر بھی کام کیے جانے لگیں۔

اِن سطور کا تعلق کسی خاص فرد یا گروہ سے نہیں، بالکل بعض اُصولی اور عمومی امکانات کو سامنے رکھ کر واضح کیا گیا کہ ہمارے راستے میں کہاں کہاں گڑھے آتے ہیں۔ اور کہاں کہاں کانٹے ہیں، جن سے بچ کے نکلنا چاہیے۔

ساتھیو! براہِ کرم تنہائی میں خدا سے ملاقات کرو۔ اور جو غلطیاں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی عمل میں آئی ہوں، اُن کا اعتراف خدا کے سامنے کرو اور ان کی معافی اور ان سے نجات پانے کے لیے دردمندی

سے دعائیں کرو۔ اللہ تعالیٰ یقیناً سنے گا اور آپ کو بھی اور آپ کے ساتھیوں اور اکابر کو بھی اور آپ کی جماعت و تحریک کو بھی حفظ و اماں میں رکھے گا۔

یہ بھی اچھی طرح جان لیجیے کہ سچی اور کھری دعوتِ دین کے پھیلاؤ اور اس کی کامیابی کا دار و مدار بھی جس چیز پر ہے وہ دعوت دینے والوں کا انفرادی اور اجتماعی طرزِ عمل ہے اور اس طرزِ عمل کا خدا کی رضا کے مطابق ہونا ہے۔

اور آخری بات یہ ذہن میں رکھیے کہ خدا خوفی کا بھاری تقاضا یہ ہے کہ ہزارہا افراد کی محنتوں اور قربانیوں کے ماحصل کے طور پر جو تحریک ہمیں امانت کے طور پر ملی ہے، اُسے بعد والوں تک صحیح سلامت پہنچانا ضروری ہے۔ اگر اس کا چہرہ مسخ ہو جائے، اس میں انحرافات پیدا ہو جائیں، اس میں رخنے پڑ جائیں اور اس کے اُصولوں، ضابطوں، روایتوں اور اخلاقیات کا ڈھانچہ ہمارے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ جائے تو ایسی عظیم امانت کو ناقص حالت میں بعد والوں تک پہنچانا بھاری جرم ہے۔

اللہ ہم سب کو اپنی نازک ذمہ داریوں کا گہرا احساس دے اور ان کو پورا کرنے کے لیے عزم اور قوتِ عمل عطا کرے اور ہر قسم کی مداہنت سے بچائے۔

قبل اس کے کہ خدا کے سامنے پہنچ کر ہمارا کھاتہ ہمارے سامنے رکھا ہو اور ہم ایک ایک لفظ اور نعرے اور ایک ایک قدم اور ایک ایک ملاقات اور پالیسی کے ایک ایک موڑ کا حساب دے رہے ہوں، آج ہی نہایت احتیاط کا رویہ اختیار کرنا چاہیے اور خود احتسابی کے ساتھ اجتماعی دائرے میں افہام و تفہیم اور تنقید و بحث کی راہیں کھولنی چاہییں۔